☆

ہمارا نو ساختہ گھر پہلی منزل پر ہے۔ گیراج سے نکلتے ہی لش لش چمکتی پکی سڑک ہے۔ یہ سڑک سرکاری نہیں۔ اس ایریا کی ہاؤسنگ نے اسے تعمیر کیا ہے، لیکن اپنی پختگی ،صفائی ،ستھرائی میں یہ کسی بھی ہائی سے کو مات کرتی ہے۔ امریکہ کا عمومی معجزہ جینز سڑکیں اور سپر مارکیٹ ہیں۔ یہاں یورپ جیسے میوزیم ،گرجا گھر اور ثقافتی عجائب گھر اپنی جغرافیائی شکل میں نہیں ہے۔ امریکہ نیا نیا ،سادہ اور نوجوان ہے، امریکن نو دریافت براعظم سے اٹھ اٹھ کر جب یورپ کی پرشکوہ تہذیبوں سے بسی ہوئی پرانی بستیوں کو اپنی پھسلتی ٹوپی سنبھالتے ہوئے گردن اٹھا کر دیکھتے تھے تو بے مہر اطالوی فرانسیسی، جرمن باسندے انہیں لکرمتوں کی طرح ہیچ اور نو دولتے سمجھ کر درخور اعتنا نہیں سمجھتے تھے ۔پرانی تہذیبوں کے ٹھیکے دار لمبے تڑنگے، ڈھیلے ڈھالے ان فصلی بٹیروں کو ابرو اٹھا کر دیکھنے کے عادی تھے پتہ نہیں کس وقت خدا نے ان کا بدلہ لینے کی ٹھانی نام دھرم نے والوں کو علم نہیں ہوتا کہ وقت کسی کو معاف نہیں کرتا پھر انہی اونچے شملے والوں کو اسی چوکھٹ پر ماتھا رگڑنا پڑتا ہے جہاں گردن اکڑائے فوں فوں کرتے وہ گزرتے جایا کرتے تھے ،اب امریکن یونیوسٹیوں ،بازاروں، دفاتر ،غرضیکہ سارے شعبہ ہائے دار و رسن میں تارکین وطن کا ایک ریلا نہہ رہا ہے۔ چینی، ہندوستانی، جاپانی، پاکستانی ،عربی، حتیٰ کہ یورپی جو مدتوں اپنی شناخت پر نازاں رہے، اپنے آبائی لباس چھوڑ کر جینز بنیان میں ملبوس امریکنوں کے نقال بننے میں فخر محسوس کر رہے تھے۔

میرے گھر والے بھہ ہور پنکھ لگا کر ہنس کی چال چلنے میں برتری محسوس کر رہے تھے اور گویا بپتسمہ لے کر نو امریکن ہو گئے تھے۔ میں اپنی بیٹی کے گھر اس لئے اجنبی سا لگا پھرتا تھا کہ یہاں پاکستانی ہونا ہی سب سے بڑا قصور ہے اور جو نالائقی امریکن میں ہے

وہ "Itsbuthuman" کے ذیل آتی ہے۔

میری بیٹی سنگل فیملی گھر میں رہتی ہے۔اس کے سامنے سڑک پار کرتے ہی ایک تین منزلہ مخملی جلد والی بلڈنگ ہے، جس میں تین منزلہ اپارٹمنٹس ہیں۔سارے مکان ایک وضع کے بنے ہوئے ہیں۔جب میں گیراج کے اوپر بنی بیلکونی میں بیٹھ کر سڑک پار دیکھتا ہوں تو عموماً میری نظر سامنے والے اپارٹمنٹوں پر پڑتی ہے دوسری منزل جس مکان میں بیلکونی کے ساتھ تھوڑی سی کھلی جگہ میں جرنیم کے گملے پڑے ہیں، وہاں ایک گریک گھرانہ رہتا ہے۔یونانی فلسفہ اور تھیٹر کی روایت سے بچھڑے ہوئے یہ لوگ عماماً بیلکونی پر آکر سگریٹ پیتے ہیں۔بیٹا ٹرک چلاتا ہے۔اتنا بڑا ٹرک جس میں پورا اپارٹمنٹ سما جائے اس کی امریکن بیوی شہر سے دور کسی فیکٹری میں کام کرتی ہے کیونکہ صبح چار بجے اس کی ٹھنڈی فوکس کو بار بار کلچ دبا کر گرم کرنے کی ضرورت پڑتی ہے ۔میں بیلکونی میں بیٹھا بوڑھے گریک کو دیکھتا ہوں۔وہ بھی کبھی کبھی ہاتھ ہلا کر مجھے وش کر دیتا ہے مجھے کس زبان میں سلام کرتا ہے، میں نہیں جانتا اسی لئے انٹرنیشنل ازارہ ہی سلامتی برادر بنتا ہے۔ویسے بھی اب انٹرنیشنل طریقہ سلام میں لفظ اہم نہیں رہے.....ہاتھ اٹھا کر صبح بخیر کا اشارہ ہی بہت ہے۔امریکہ میں سلام کرنے کا رواج عام ہے۔جنگلوں میں، راستوں پر، بازاروں میں لوگ ایک دوسرے کو ہائے کہہ کر صبح بخیر، شام بخیر کہنے کے عادی ہیں..... ہلکی سی مسکراہٹ اور..... انسان کی انسان شناسی اور خدا حافظ.....بوڑھا یونانی سانولی رنگت کا مالک ہے۔اس کا سر قریباً گنجا ہے اور کان سے کان تک گردن سفید بالوں کی جھالر ہے۔وہ دنیا کو قانونی عطا کرنے والوں سے نکل کر یونان کو چھوڑ کو امریکی قانون پرست ہو چکا ہے۔ہاؤسنگ والوں کا حکم ہے کہ کوئی مکین گھر کے اندر سگریٹ نہیں پی سکتا کیونکہ لکڑی کے گھروں میں آگ کی واردات عموماً چپکے سے ہو جاتی ہے۔اسی لئے یہ بہو، بیٹا باپ سب جرنیم والی بیلکونی پر کل کر سگریٹ پیتے ہیں۔چونکہ گرمیوں کا موسم ہے، اس لئے یونانی بر موڈا نیکر پہنے رکھتا ہے۔اس کے گھٹنوں کو اسی لیے میں دیکھ سکتا۔ایسی نیکر کا بر موڈا نیکر

نام نہ جانے کیوں رکھا گیا۔کیا اس کا تعلق برموڈا تکون سے ہے؟

اس سائنسی دور میں بھی انسان اسرار سے محبت کرتا ہے۔ان دیکھی ان چاہی ان سمجھی منزلیں اسے کھینچتی ہیں۔ایک مدت سے برموڈا تکون بھی ایک الجھن ایل پہیلی بنی ہوئی ہے۔اٹلانٹک میں برموڈا،میامی،فلوریڈا، سان جوآن،یورٹوریکو کے درمیان ہے،اس علاقے میں ان گنت ہوئی اور بحری جہاز راستہ بھولے،غرقاب ہوئے ان کی پر اسرار گمشدگی سے متاثر ہو کر بے سمار لوگوں نے اس پر ریسرچ کی ۔قریباً2000 کشتیاں یہاں راستی بھولیں اور زیر آب ڈوب گئیں ۔سنتے ہیں سن 1991ء میں ہالووین رات تھی ،جو ورڈی پائیلٹ Talla Hasse کی جانب جہاز لے جا رہا تھا کہ برموڈا تکون میں پھنس گیا یکدم اس کی آواز بگڑ گئی ۔وہ خوفزدہ ہو کر رطب ویابس بکنے لگا ۔۔۔۔''نومبر کی دوسری تاریخ ..... چار وہسکی جولیٹ میں ..... ہٹاؤ دو پانچ تین ..... زیرو زیرو ..... اور پر چڑھنے کی درخواست دو مرتبہ نوصفر ..... اوور..... اوور..... '' آواز ختم ..... جہاز غائب..... کنٹرول روم دم بخود..... اسرار آج تک لاینحل..... ہولووین کی پر اسرار رات..... سن 1991ء کا سال۔

واقعات کے تواتر کے باعث سائنس دان اسرار معلوم کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔کچھ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ اس تکون میں دارصل شمالی اور مقناطیسی شمال میں بنیادی فرق ہے۔اسی بیس ڈگری کے فرق کے باعث حادثات ہوتے ہیں۔دنیا کا مقناطیسی شمال نارتھ پول سے 1500 میل دور ہے۔اس بات کا دھیان جب نہیں کیا جاتا تو بحری اور ہوائی جہاز شمالی پہنچنے کی بجائے پرنس آف ویلز کے جزیرے پر پہنچ سکتے ہیں اور اسی غلطی کے باعث برموڈا تکون حادثاتی کہانیوں کی دیومالا بن گیا ہے۔

ساحلی گارڈوں نے اس اسرار میں کئی قسم کے اضافے کئے ہیں۔کچھ سائنس دان اس نتیجے پر پہنچے ہے کہ ان حادثات کی بنیادی وجہ Static بجلی ہے..... متجسس

لوگ خود جا کر تحقیق کرنا چاہتے ہیں۔ سر پھرے کہانی گھڑنے کے شوق میں پہنچ جاتے ہیں۔ اخباری دنیا ویسے ہی خبر بنانے کی خاطر اس ابلیسی تکون میں گہری دلچسپی رکھتی ہے۔

ایک بات طے ہے کہ انسان تحقیق کے باوجود ابھی تک یہاں کے اسرار کو جان نہیں پایا۔ اس 1,50,00 مربع میل کے علاقے، سے متعلق ان گنت کہانیاں گھومتی پھرتی ہیں۔ کچھ دیو مالائی، کچھ من گھڑت .... یہ انسانی ذہن کا تضاد وصف ہے کہ وہ ہمیشہ حقیقت سے خیال اور خیال سے حقیقت کی طرف سفر کرتا ہی رہتا ہے۔ اسے تحقیق اور خواب سے برابر کی محبت ہے اور وہ ان دونوں کے درمیاں جھولے کی مانند آتا جاتا ہے۔ جسم ہمیں اندر کی جانب دھکیلتا ہے اور روح کی وسعت سمٹ سمٹا کر ہمیں باہر کی جانب دھکیل دیتی ہے۔ انسان کے اندر بھی ایک برموڈا تکون ہے جس میں اس کے جہاز کشتیاں غرق ہو جاتی ہے اور پھر ساری زندگی ان غرقاب جہازوں کے لئے Rescue Parties بھیجتا رہتا ہے.... کبھی سائنس تحقیقی تاویلین دیتا ہے، کبھی بھید بھاؤ کے انتر دریافت کرنے میں گزرتا ہے.... کسی مقام، وقت اور حالات میں اس کے اندر باہر ظمانیت کی نرم ہوا نہیں چلتی تا آنکہ.... اوپر سے فضل نہ ہو جائے۔

''ابا جی.....''

''جی بیٹا.....''

''ہم ایک دن Left Overs کھاتے ہیں اور سنڈے کو میں کوکنگ کرتی ہوں اور سارے ہفتے کی dishes تیار کر کے فریزر میں رکھ دیتی ہوں۔ میرا خیال ہے آپ مائنڈ نہیں کریں گے۔ دیکھئے ناں مجھے بھی کام پر جانا ہوتا ہے۔ آپ فریزر میں سے کچھ نہ نکالیں اور جو کچھ فریزر میں رکھا ہوا ہے، آپ مائیکرو ویو اوون میں ڈال کر گرم کر لیں۔ ہم ڈسپلن سے Organize ہو کر زندگی گزارتے ہیں

.....افسوس میں آپ کی ویسی خدمت نہیں کر سکتی جیسی پاکستان میں کرتی تھی، لیکن امید ہے آپ یہاں کے طریقے سیکھ جائیں گے۔" ارجمند کے لہجے میں وضاحت ہے۔ جیسے وہ

کسی سیمینار سے مخاطب ہو۔

"بالکل بالکل میں سمجھ گیا ہوں۔ یہاں کی زندگی اور ہے، وہاں کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔"

"ابا جی دیکھئے نا وہاں سارا گھریلو نظام ملازموں کے سہارے چلتا ہے۔ پھر عورتیں گھر پر ہوتی ہیں۔ تازہ پھلکا روٹی مل سکتی ہے۔ یہاں تو پیتا بریڈ سے ہی کال چلانا پڑتا ہے....."

"بالکل بالکل..... میری فکر نہ کرو..... میں بالکل ٹھیک تھاک ہوں۔"

"خیر جی Worry تو ہوتی ہی ہے ابا جی۔ آپ کے دانت بھی خراب ہیں۔ میں آپ کے لئے کسی قسم کی بریڈ لائی ہوں، لیکن پھلکا پراٹھا نہیں پک سکتا پراٹھے تو شاید پکا کر رکھا جا سکتا ہے، لیکن روٹی خشک ہو جاتی ہے.... آپ لیٹ جائیں تھوڑی دیر کے لیے۔"

"نہیں ٹھیک ہے....."

"کوئی فلم لگا دوں؟..... ٹی وی پر... وہ سی آر والی"

"نہیں نہیں تم میری فکر نہ کرو ارجمند.... میں وہاں بھی اکیلا تنہا تھا۔ مجھے تنہا رہنے میں وقت پیش نہیں آتی"

"کوئی چیز درکار ہو مارکیٹ سے؟..... میں آگ گروسیز کرنے جاؤں گی کام کے بعد...."

"مجھے کچھ نہیں چاہئے ارجمند"

"جمشید اور قیصر سکول بس سے آتے ہیں۔ وہ بل دیں گے تو دروازہ کھول دیجئے

گا''

مجھے پوچھنا تو نہیں چاہئے تھا، لیکن میرے منہ سے نکلا ''بھائی جب میں نہیں تھا تو پھر بچے کیسے گھر میں داخل ہوتے ہیں....''

''ان دونوں کے پاس اپنی اپنی چابی ہے ابا جی ....'' ارجمند ہنستے ہوئے بولی ''دونوں بڑے Independent ہیں۔ اگر کوئی ایمرجنسی ہو جائے تو ساتھ والے گھر میں ڈورتھی رہتی ہے وہ رات کو ڈیوٹی پر جاتی ہے۔ دن کو گھر پر ہی ہوتی ہے۔ بچے اس سے ہلپ لے لیتے ہیں۔ اگر کبھی وہ بھی گھر پر نہ ہو تو Alone Hotline Home کا نمبر دے رکھا ہے کئی Grandmas--Grandpas والنیئر بھی تین سے لیکر چھ بجے تک فون پر مل جاتے ہیں۔ بچوں کو کوئی دقت پیش نہیں''

''پھر بھی ارجمند..... بچے تو آخر بچے ہیں۔''

''آپ فکر نہ کریں ابا جی۔ وہ آپ کو بالکل نہیں ستائیں دے وہ Sefl Sufficient ہیں۔ فریج سے نکال کر کھالیں دے۔ ویسے قیصر تو دودھ اور چپس کچھ نہیں کھاتا..... ابھی مونٹسوری میں ہی تو جاتا ہے''

''ٹھیک ہے... ٹھیک ہے۔ میں یہاں دخل اندازی اور مشورے دینے کے لئے نہیں آیا....''

''اچھا ہے ابا جی..... آپ کا چینج ہو جائے گا۔ روٹین سے بریک مل جائے گی۔ ایک ہی جگہ رہ رہ کر آدمی بور جاتا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ نے ہمت کی.... اور میرے پاس آ گئے.... میرے مان لی۔''

میں ارجمند کو بتا نہ سکا کہ مجھے نہ تو تبدیلی کی ضرورت تھی نہ ہی میں رٹین کو توڑنے کے لئے اس کے پاس آیا تھا۔ مجھے پتہ نہیں کیوں ایک خوف تھا، ایک تشویش تھی کہ شاید ارجمند سات سمندر پار ایک نئے معاشرے میں لب سینے دبی دبی، گھٹن بھری زندگی بسر کر رہی ہو۔ میں اپنی آنکھوں سے اپنے حساب کے مطابق اس کے ماہ و سال

کا اندازہ لگانا چاہتا تھا.... باپ کی بھی عجب مصیبت تھی۔ وہ بیٹی سے کٹ کر بھی علیحدہ نہیں ہو پاتا اور بیٹے کے ساتھ رہ کر بھی اسے مل نہیں پاتا۔

امریکہ پہنچ کر کسی نو وارد نے پڑتا لگایا کہ کسی ملک میں نو شہری ہونے کے معنی یہ ہیں کہ زیادہ سے زیادہ سوال نہ پوچھے جائیں، ورنہ لوگ آپ کو انجان سمجھ کر کمتر جانیں گے۔ لوگوں کو اشیاء کی طرح سمجھیں، استعمال کریں اور پھر آزاد چھوڑ دیں۔ درد دل اسے اپنے آپ کو محفوظ رکھیں۔ اپنے آبائی وطن کو پہلی بیوی کی مانند کہیں اندا ینت کر رکھیں، لیکن اس کی خوبیوں خرابیوں کا قطعاً ذکر نہ کریں۔ پتہ نہیں سننے والے پر اس ذکر کا کیا اثر ہو..... ایک ہی شخص کو دو مرتبہ دھوکا نہ دیں۔ آپ کے وطن کی شہرت کا سوال ہے..... پس ماندہ ترقی پذیر ملکوں کے نادار لوگوں کی مدد کرنے والے اداروں کو چندہ نہ دیں۔ نہ جانے ان کے پیچھے سیاسی کٹھ جوڑ کیا ہو.... ہمیشہ ایسی تحریکوں میں شامل ہوں جو گلہریوں، Flaminqoes اور Skunks کے لئے پریشان ہیں۔ وائلڈ لائف میں دلچسپی لینے سے انسان زیادہ کلچرڈ لبرل اور انسان دوست شمار ہوتا ہے۔

یہ انفرمیشن مجھے ایک مقامی رسالے سے ملی تھی۔ ایسے اخبار رسالے سیروں کے حساب سے مغربی ممالک میں چھپتے ہیں۔ ان میں سیکنڈ ہینڈ قسم کی گوسپ، مشورے اور خبریں ہوتی ہیں۔ پہلے میں یہ تھیسے اٹھا کر اندر لے آتا تھا اور بیلکونی میں بیٹھ کر وقت بے وقت پڑھتا رہتا تھا، لیکن اب ارجمند نے مجھے منع کر دیا ہے۔

''ابو یہ اخبار اندر کون لایا.... ردی انفرمیشن!''

میں اب یہ اخبار رسالے گھر کے پچھواڑے چھوٹے سے باغ میں بیٹھ کر پڑھتا یوں اور تقابلی سوچوں میں ڈولتا رہتا ہوں۔

جب میں گیراج کے اوپر بیلکونی میں بیٹھ کر دیکھتا ہوں تو سامنے والے اپارٹمنٹسکی بلڈنگ کے ساتھ مجھے ایک ننھا منا سا باغ نظار آتا ہے۔ اس میں چھوٹا سا سلائیڈ

ہے، دو تین جھولے ہیں۔ ایک جنگل جم ہے جو کافی خطرناک کھیل ہے۔ لوہے کی اس بھول بھلیوں میں بچے الٹے لٹک کر اپنی گردن تڑوا سکتے ہیں۔ اس پارک میں امریکن بچے عموماً اکیلے آتے ہیں۔ خود اعتماد بچوں کے ساتھ کوئی نرس، آیا ماں یا دادا نہیں ہوتا لیکن کالے، امریکن، ہندوستانی، پاکستانی اور دوسرے تارکین اپنے بچوں کے ساتھ کسی نہ کسی بڑے کو ضرور بھیجتے ہیں۔ میری گوری بیٹھ ارجمند اور اس کا دبلا پتلا لمبا ڈاکٹر میاں اپنے آپ کو ایشیائی نہیں سمجھتے۔ جس طرح ترک نژاد اپنے آپ کو یورپ کا حصہ بنانے پر بضد ہیں، ایسے میری بیٹی اور ڈاکٹر داماد مصر ہیں کہ امریکن سیٹزن ہو جانے کے بعد اب ان پر امریکی مہر پکی ہو گئی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ امریکہ تو بنیادی طور پر تارکین ہی کا وطن ہے، اس لیے وہ بے وطنے نہیں ہیں۔ وہ بھی قیصر اور جمشید کو اکیلے ہی باغ میں بھیج دیتے ہیں۔ میں جب سے آیا ہوں، نہ جانے کس خوف کے تحت میں بھی کھسکتا کھساتا ان کے پیچھے پہنچ جاتا ہوں حالانکہ انہیں میری ضرورت نہیں ہوتی۔ پتہ نہیں یہ احساس کمتری ہے کہ احساس تحفظ!

باغ میں جمشید اور قیصر کو میری قطعاً ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ وہ Slides اور جھولے بڑی آزادی اور خوش اعتمادی سے استعمال کرتے ہیں۔ اگر کبھی گر جائیں تو ریں ریں روں روں کر کے روتے نہیں دیکھا۔ وہ آپس میں ایک جملہ بول کر معاملی درست کر لیتے ہیں۔ It"Brave----"Don't be Sissy"---"Be a Man" میں بینچ پر بیٹھ کر چوری چوری ان کی نگرانی بھی کرتا ہوں اور سوچتا بھی رہتا ہوں کہ ایک بہادر آدمی کو ایک Bully بننے میں کتنی دیر لگتی ہے؟

1971ء میں جب روس نے اشتراکی نظام حکومت اپنایا اور دنیا میں دو بہادر سپر پاورز کا وجود ابھرنے لگا تو جلد ہی دنیا نے دیکھا کہ ساری دنیا کو ان دو بہادروں نے

بندر بانٹ کے فلسفے کے تحت، اپنے اپنے لیے مارکیٹ تلاش کرنے کے سلسلے میں اپنی حاکمیت جتانے کی خاطر تھرڈ ورلڈ کی اصحت شروع کردی.... امریکہ اور روس کی دیکھا دیکھی یورپ اور انگلستان بھی اس دوڑ میں کود پڑے۔ اب تھرڈ ورلڈ میں اسلحہ ،دوائیں، ناکارہ اور کارآمد ٹیکنالوجی کے بازر لگ گئے۔ ابھی ترقی یافتہ ممالک Sick Industries کے تصور سے نا آشنا تھے۔ اسی لیے رفتہ رفتہ اپنے دباؤ اور بہادری کے ذریعے ساری دنیا Zone میں بٹ گئی۔ اب کچھ امریکہ کے بٹیرے تھے اور کچھ روس کے لوٹے۔

لیکن 1991ء میں جب روس کے اقتدار کے پرخچے اڑے اور دنیا میں ایک ہی سپر پاور رہ گئی .... تو ایک اور آدرشی تحریک فیل ہوگئی... حالات کچھ اور کے اور ہوگئے۔ اب امریکہ اور بھی بہادر، بولڈ اور دہشت پسند ہوگیا۔ وہ اپنے نیو ورلڈ آرڈر سے دنیا کے ممالک کے دھمکانے ،ڈرانے اور پچکارنے میں کامیاب ہونے لگا.... لیکن اندر ہی اندر اسے ایک طاقت کا خوف تھا.... روس کی آدرشی تحریک دم توڑ گئی، لیکن اسلام کی طاقت اندر ہی اندر امریکہ کو کہیں سہار رہی تھی..... اگر تمام مسلمان حکومتیں کسی طور پر یکجا ہو جائیں، پھر یہ اتنی لمبی چوڑی Belt کو توڑنا یا سنبھالنا اس کے لئے مشکل ہوتا۔ لکڑی کا یہ گٹھا توڑنا اس کے لئے ممکن نہ ہوتا، لیکن امریکہ کے بہادر جیالوں نے ہر مسلمان مملکت کے لئے الگ پلان بنایا۔ ایران اور عراق کی جنگ میں دو مسلم طاقتوں کو آپس میں لڑا کر دونوں طاقتوں کو کمزور کردیا۔ ان طاقتوں کے دانت کھٹے کرنے کے بعد سعودی عرب کو یقین دلایا کہ اب عراق ان کی سالمیت کو دھچکا لگانے والا ہے۔ اس کے لیے کویت کی حکومت کو ایکشن پر اکسایا اور خود سعودی عرب میں اپنے جنگی سوائل لے کر ایسے بیٹھ رہا کہ ہلانا مشکل۔ سوڈان کو دہشت گرد بنا کع خانہ جنگی اس پر مسلط کر کے اسے تباہ کردیا۔ پاکستان کو حکومتوں میں باہمی تنازعوں کو فروغ دے کر بدنظمی اور بدنظامی میں مبتلا کر کے دولخت کردیا۔ ترکی کو یورپ کی منڈی کا حصہ

اس لئے بننے نہ دیا کہ وہ احساس کمتری کا شکار ہو کر امریکہ کے آگے کاسہ گیر رہے اور امریکہ کے لئے جاسوسی کرتا رہا۔الجزائر میں ڈیموکریسی کا پتا پھینکا اور جب دیکھا فنڈا منٹلسٹ کامیاب ہو گئے ہیں تو یہاں فوجی راج قائم کر دیا۔افغانستان کو روس کی آدرشی تحریک ختم کرنے کے لئے استعمال کیا اور بعد ازاں احسان فراموشی کا ثبوت دیا۔بوسنیا کو سربیا اور کروٹیز کے آگے پھینکا اور کچھ کرنے جوگا نہ چھوڑا۔

روس کی شکست کے بعد امریکہ نے مسلمان ملکوں میں اپنے اسلحہ کے مارکیٹ قائم کیے۔وہ ترقی پذیر ملکوں کو ایسا بیچتا جو زیادہ Sophisticated نہ تھا۔بہادر امریکہ کو علم تھا کہ جب کسی ملک میں اسلحہ ہوتا ہے تو وہ استعمال میں ضرور آتا ہے۔پھر ہر مظلوم اسی اسلحہ کے ہاتھوں کبھی کبھی ظالم بھی بن جاتا ہے،دین دار گروہ تک اپنی حفاظت کے لئے اسی اسلحہ کا سہارا لیتے ہیں۔سیاسی

جماعتیں اپنی مضبوط اسی اسلحے سے قائم کرتی ہیں.... کمزور کو ان ہی ہتھیاروں سے طاقت ملتی ہے۔پھر اسی اسلحے کی برکت سے شہروں میں وارداتیں ہونے لگتی ہیں۔گروہی اجتماعی جھگڑے فروغ پاتے ہیں۔ڈاکو اٹھائی گیرے،دہشت گرد اسی اسلحے کی بنا پر زیادہ جی داری کے مظاہرے کرتے ہی۔ٹرینوں میں بم پھٹتے ہیں۔کاریں چرائی جاتی ہیں،ڈکیتیاں ہوتی ہیں۔ان تمام وارداتوں کی تفاصیل سپر پاور کے کارندے فتح مندی کے ساتھ اپنے مالکان تک پہنچاتے ہیں....ایسے ملکوں میں میر جعفر جیسے شخص تلاش کرنا بھی مشکل نہیں ہوتا۔شک وخوف سے لرزاں شہریوں کو دو نظریوں،دو پارٹیوں میں تقسیم کرنا بھی مشکل نہیں..... مسلمان ملکوں کو کسی وقت بھی کوئی میر جعفر اپنی حرص کے باعث اسلحے کی فراہمی کے ہاتھوں خانہ جنگی میں ڈبو سکتا ہے۔مسلمانوں کی زبوں حالی کسی وقت میرا ساتھ نہیں چھوڑتی اور میں اس سلسلے میں کچھ کر بھی نہیں سکتا۔تب ہی سانده کلاں میں رہتے تھے۔

کرشن نگر سے آگے متوسط لوگوں کی بستی تھی۔یہاں کے گھر پکے،صحن گھر کے اندر

اور گھروں میں بسنے والے نچلے درمیانی انکم کے لوگ تھے۔ان لوگوں کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ یہ حیادار تھے۔اپنے آپ کو قسم کی حد تک شریف سمجھتے اور دوسروں کی نظروں میں شریف رہنے کے لئے بڑے جتن کرتے، بڑی بڑی قربانیاں دے کر بھی اپنا Image برقرار رکھتے۔قرضے لینے اور دینے سے گھبراتے۔بچوں کو گلیوں میں کھیلنے سے منع کرتے اور عورتوں کو چادر یا برقعے میں دیکھ کر اطمینان کا سانس لیتے، ہر وقت ناک کی سیدھ چلنے میں لگے رہتے۔ابا نے بھی قیام پاکستان کے بعد ایسے ہی ایک گھر کو پینتیس روپے ماہوار کرائے پر لے رکھا تھا۔ابا سیکرٹریٹ میں ملازم تھا اور کلرک ہونے کے ناطے اس کی ذہنیت میں مے ن میخ نکالنے کی عادت تھی۔جس طرح کلرک کو رولز کا علم ہوتا ہے، ایسے کسی افسر کو اپنی طقت اور ناطاقتی کی حدود کا علم نہیں ہوتا۔کلرک ہی افسر کو صاحب بہادر بناتا ہے، وہی اسے من مانتا سکھاتا ہے اور وہی اس کا انفنٹری فورس بھی ہوا کرتا ہے۔افسر کی ساری جان اسی کلرک کی مٹھی میں ہوتی ہے۔پی اے اور کلرک کے سامنے افسر کی نجی اور سرکاری زندگی کے کئی ایسے صفحے موجود ہوتے ہیں جنہیں Confidential کہا جاتا ہے۔

ابا گھر میں گھستے ہی کلرک نہ رہتا۔وہ سیکریٹری ایجوکیشن بن جاتا جس کے سامنے کھڑے ہو کر آبا خود Dictation لیا کرتا تھا۔۔۔۔ہم پانچوں بھائی بہن ابا کو دیکھ کر پرندوں کی طرح اڑنچھو ہو جاتے۔بڑے بھائی شاہد البتہ ابا جی نہ دبتے تھے۔رفعت آپا اور شاہد بھائی کی اپنی Category تھی۔وہ دونوں ڈارکل اور نینٹل نہیں تھے، لیکن غائب وہ بھی ہو جاتے لیکن بڑے رعب سے۔

تب شاہد بھائی فارتھ ائیر میں پڑھتے تھے۔ابا کے لئے سیکریٹریٹ دور نہ تھا تو شاہد بھائی کا ایم اے او کالج بھی قریب ہی تھا، لیکن شاہد بھائی اپنی نویافت آزدی میں سرشار تھے۔وہ اپنے بھانویں شاعر بن رہے تھے کالج کی سرگرمیاں تو انہیں گھر سے

دور لے جاتی ہی تھیں ۔اوپر سے رات کو کافی ہاؤس کی نشستیں بھی انہیں گھر سے غائب رکھتی تھیں ۔ابا کو جلد سونے کی عادت تھی اسی لیے ان کا ٹاکرا شاہد بھائی سے نہ ہوتا ۔امام چولہے کے پاس بیٹھ کر شاہد بھائی کا انتظار کرتی رہتیں ۔ان کے نزدیک محبت میں تکلیفیں سہنا، ایثار کرنا اور دوسرے کے آرام راحت کی خاطر اپنی ذات کو تلف کرنا دلیل محبت تھی ،شاہد بھائی کے لیے وہ اس طرح کنڈی کھولتیں کہ ذرا سا شور بھی نہ ہوتا ،چپاتی یوں پکائی جاتی کہ رتی بھر کھڑاک نہ گونجتا ۔پھر اماں ستر پوش اتنی زیادہ تھیں کہ ابا تک یہ رپورٹ کبھی نہ پہنچی کہ رات شاہد دیر سے آیا.... اس محبت نے شاہد بھائی کو بے باک کر دیا ۔انہیں وقت بے وقت کج راہ ہونے پر آمادہ کیا ۔اس بات کا اماں کو نہ احساس تھا نہ ادراک ،وہ تو بس اپنی توڑ نبھانے کی فکر میں تھیں ۔انہوں نے کبھی کسی سے کوئی توقع نہ رکھی..... نہ اپنے بچوں ،نہ اپنے شوہر نہ اپنے کسی عزیز رشتہ دار سے .....وہ صرف اپنا لیکھا صاف رکھتی تھیں ۔ماں نے ساری عمر جھوٹ نہیں بولا ،نہ اپنے آپ سے نہ کسی اور سے ۔

جب انسان محدود خواہشوں اور ضرورتوں کا پابند ہوتا اسے زیادہ جھوٹ بولنے کی ضرورت بھی پیش نہیں آتی ،لیکن جب کبھی اسے گھر کے خرچ سے کچھ پیسے نکال کر شاہد بھائی کو دینے پڑتے تو وہ اس کا ذکر نہ اپنے آپ سے کرتیں ،نہ ابا جی سے..... اور جھوٹ کے اس واحد کنوئیں میں گر جاتیں ۔اس گھٹتی لڑائی سے پسپا ہو کر کبھی کبھی وہ اونچے اونچے استغفار پڑھنے لگتیں اور اپنے آپ کو عادی مجرم اور گناہی سمجھنے پر مجبور ہوتیں ،اماں کی اسی بے جان ،ناتواں محبت نے شاہد بھائی کو گرد ایسا حصار باندھ رکھا تھا جس سے نکل کر وہ کبھی دور نہ جا سکے ۔جس طرح مہارانی سیتا کی کٹیا کے باہر مہاراجہ رام چند نے ایک لکیر کھینچ دی تھی جس سے باہر نکلنے کا آڈر نہ تھا ۔ایسے ہی اماں کی سب انتظاریوں نے شاہد بھائی کی شاعر مزاجی کو پابند کر لیا تھا ۔وہ لمبی اڑانوں پر

جانے کی آرزو تو رکھتے تھے لیکن وہ کولمبس نہ بن سکے اور کسی نئی دنیا کا انکشاف ان کا مقدر نہ ہو سکا۔

افریقہ کی کھوسہ زبان میں جانوروں کے سینگوں کے لیے گیارہ مختلف لفظ ہیں۔ آگے جھکے ہوئے، پیچھے کی جانب باہر کو مڑے ہوئے، چھدرے، سخت، مڑ کنے وغیرہ۔ جنگل کے باسی ان الفاظ کے بغیر جانوروں کو بیان نہیں کر سکتے۔ جس طرح ایک آرٹسٹ رنگوں کے ہر شیڈول کے نئے لفظ سے واضح کرتا ہے۔ آج ترقی کے عہد میں بہت سے نئے الفاظ ایجاد کی تازگی کے ہمراہ در آئے ہیں۔ کمپیوٹر، فون، کریڈٹ کارڈ، سی ڈی ٹیلی ویژن، ای میل، فیکس، مائیکرو اوون لیکن ان اشیاء کے در پردہ جو الجھنیں، تاویلیں، نظریئے، جواز پیدا ہو رہے ہیں اور زندگی میں نئی ایجادات، حالات کے باعث جو دھارا بہہ رہا ہے۔ اس کی اصلاحات ابھی مکمل اور عام نہیں۔ افقی سوچ منفی رویے، فوکس۔ ڈیزائین، ورلڈ آرڈر، ہیومن رائٹس، سسٹم، گڈ گورنس، ڈیموکریسی ڈیزائنر کپڑے ایسی بے شمار اصلاحات نئی ہیں۔ لیکن افسوس وہ اصطلاحات سوسائٹی سے غائب ہو رہی ہیں جو اماں کی انتظاریوں کو ظاہر کرتی تھیں.... زندگی کی رفتار تیز ہو جانے کے بعد اپنی من مانی کو شعار زندگی بنا کر محبت، گھائل بہادری، انتظار، ایثار، ممتا، سیاگ، حیا، وفا ایسے ہی الفاظ استعمال میں نہ ہونے کے باعث خوبیدہ الفاظ کی ذیل میں آنے لگے ہیں۔ طریق زندگی بدلنے کی وجہ سے یہ وہ معنی ظاہر نہیں کرتے جو کبھی استعمال میں تھے اور بامعنی بھی تھے۔

ہمارا گھرانہ گاؤں سے آیا تھا۔ اپنے ساتھ ہم گاؤں والوں کی خوش اعتمادی بھی لائے تھے۔ درختوں، کھیتوں، جنگلوں میں رہنے کے باعث پرندوں جانوروں کی ہم جنسیت کی وجہ سے گرائیں کا ذہن تر و تازہ ہوتا ہے۔ وہ تجربے سے سیکھتا اور فوک

وزڈم پر بھروسہ کرتا ہے۔اس میں وہی معصومیت۔اکھڑپن، سادگی اور بے ساختگی بھی ہوتی ہے جو گاؤں والوں کے رسم ورواج اور لوک ریت میں نظر آتی ہے۔کھیتوں میں گھومتے پھرتے دیہاتی تازہ سبزی، گنے، بیر، پیلو، کروندے غرضیکہ ہر تازہ چیز کو بہ آسانی منہ مار سکتا ہے۔چونکہ کسان کی خوارک دودھ، دہی، مکھن، لسی، تازہ غلے اور گڑ شکر کا مجموعہ ہوتی ہے۔اس لیے اس کا توانا جسم جاندار اذہنیت کو جنم دیتا ہے۔وہ چلتے چلتے اکھان بناتا اور اندہ رکھتا ہے۔پینڈو کی زندگی اس کے تجربے اور مشاہدے کیا ہوتا ہے جس کا وہ ذکر کرتا رہتا ہے۔شہری انسان کا علم کتاب میڈیا اور سنی سنائی کا مرہون من ہوا کرتا ہے۔کئی بار شہری کو اپنے شہر کا جغرافیائی نقشہ بھی معلوم نہیں ہوتا اور ان اشیا کی واقفیت بھی نہیں رکھتا جن کا خرچ اس کی جیب پر بار ہوتا ہے لیکن وہ ان چیزوں کا ذکر کرنے سے نہیں ٹلتا اور اپنے اکتسابی علم کی شیخی بگھارنے سے باز نہیں آتا۔

پینڈو روزی کی خاطر شہر کا رخ کرے تو وہ اپنی ذہانت ساتھ لاتا ہے، لیکن شہر میں آتے ہی اسے احساس کمتری ہونے لگتا ہے۔سب سے پہلے تو اسے وہ زبان ششدر کرتی ہے جس کا ماخز کتابیں، ابلاغ کے جملہ وسائل اور مارکیٹ جنم دیتے ہیں ..... لباس تو وہ جلد ترک کر دیتا ہے لیکن زبان سیکھنے کے لیے اسے کچھ مدت درکار ہوتی ہے، لیکن جسے پینڈو سمجھ کر شہری لوگ برخاست کرنا چاہتے ہیں، وہ اپنے تروتازہ دماغ کے باعث تجربے سے سیکھی ہوئی فہم وفراست کے باعث بہت جلد شہری کے سامنے سیڑھیاں چڑھنے لگتا ہے۔اسے آداب محفل سیکھنے میں دیر لگتی ہے کیونکہ یہ وہ پانی نہیں جن میں اس نے تیرنا سیکھا لیکن مجلسوں میں زندہ دلی پینڈو ہی کے دم قدم سے ہوتی ہے۔شہری انہیں ان پڑھ سمجھتے ہیں، لیکن پھر اسی کی گھڑت کے ٹوٹم اور Taboos شہری معاشرے میں لہو کی طرح ڈوڑنے پھرنے لگتے ہیں۔دیہاتی کی ترقی شہر میں اور بھی تیز ہوتی ہے جب یہ تعلیم کی سان ہر چڑھے الفاظ کا جنتر منتر سمجھ

پائے ارگفتگو کے اتار چڑھاؤ میں دیہاتی تجربے سمونے لگے تو شہری اس کا مقابلہ نہیں کر پاتے۔

چاچا صمد ہمارے ساتھ والے گاؤں سے آیا تھا اور پکا پینڈو تھا۔

چانے مے ایک جیتی جاگتی، ہنس مکھ پر امید روایت زندہ تھی۔ وہ مبالغے کی حد تک سوشل تھا اور کسی سیاسی لیڈر کی مانند اسے گفتگو کا فن ازبر تھا۔ گھر کا دروازہ کھلتے ہی وہ برسات کی ٹھنڈی ہوا کی طرح خوشی کے جھونکے ساتھ لاتا تھا۔ چاچا صمد کا سواگت سبھی کرتے۔ سب سے پہلے وہ اماں کو تلاش کرتا۔ ماں کے پاس پیروں بھار بیٹھ کر وہ ہر بات سرگوشی اور پریم سے کرتا۔

''کیا ہو رہا ہے بھابھی؟.....''

''کچھ نہیں ویر۔ گھٹنے میں درد ہو رہا ہے۔ ذرا سینک دے رہی تھی''

چولہے کی لکڑی نکال کر چاچا صمد اپنا سگریٹ جلاتا اور ایک آنکھ میچ کر دھواں چوڑتا۔

''بھابھی وہ میں سابنے کا تیل چھوڑ گیا تھا۔ اس کی مالش کر کے دیکھی''

''دو دن لگایا تھا۔ آرام بھی آ گیا تھا تھوڑا بہت .... پر پھر نا جانے کدھر رکھ دیا تیل.....''

''اور لا دوں گا.... اور لا دوں گا تو فکر نہ کر..... سابنے ہی سابنے تیل ہی تیل۔''

''جیتا رہ خوش رہ''

اماں ساری کی ساری پسیج جاتیں۔ ویسے بھی اماں کی محبت ہی ایسی تھی، جس کسی پر مہربان ہوتیں، اس کے خلاف کچھ نہ سن سکتیں۔ پھر جو عیب بھی نکلتا کسی دوسرے کی غلطی

سے نکلتا۔ اپنی آنکھ سے دیکھ کر بھی انہیں یقین نہ آتا کہ جس بت کی پرستش وہ کرتی ہیں وہ ٹوٹ بھی سکتا ہے۔ گونگا، بہرہ ہے اور کسی کام نہیں آسکتا۔

دیور کے معاملے میں وہ سکھ سردارنیوں کی طرح زدہ تھیں۔

وہ دیور سے اس طرح کا برتاؤ کرتی تھیں جیسے چھوٹے بیٹے سے معاملہ ہوتا ہے۔ الجھتیں جھڑکتیں، ماتھا چومتیں، بازو پکڑ کر جھنجھوڑتیں، دوپٹے سے پسینہ پونچھتیں، گرم گرم پھلکے کو دیسی گھی سے چوپڑ کر پیش کرتیں، غریبی کے باوجود انڈے تل کر دیتیں، دیور بھی خوش دلی کا بادشاہ تھا۔ فلمی ڈائیلاگ بول بول کر اماں کو لارے لگائے رکھتا۔ جو چیز اس کے کام کی نہ ہوتی۔ اسے بڑے تپاک اور حساب سے اماں کو پیش کرتا۔ اماں سے چاچا صمد کو رشتہ استوار کرنے کی کوئی ضرورت پیش نہ آتی۔ یہ رشتہ بنا بنایا آیا تھا۔ جس روز اماں بیاہ کر آئی تھیں اس روز اپنے سے دس سال چھوٹے دیور کو گودی میں بٹھا کر سارے گھر والوں نے صمد چاچا کو اماں کا متبنیٰ بنا دیا۔ اس دن کے بعد چاچا اور اماں کا رشتہ عاشق سے کم کم اور دوست سے زیادہ رہا۔ ابا اجے منہ، بند آنکھوں، سرد ہاتھوں والا ایک ملاقاتی تھا۔ اس لئے چاچا صمد کی

گرم جوشی نے اماں کے دل چولہے کو گرم رکھا۔

چاچا گھر میں یوں بکھرتا جیسے کبھی سوڈے کی بند بوتل کھلتے ہی جھاگ سمیت ادھر اُدھر بکھر جاتی ہے۔ چولہے کے پاس بیٹھ کر ابلتی چائے، گرم روٹی اور تازہ لسی پی پا کر چاچا اوپر کی منزل میں چڑھ جاتا ہے۔ شاہد بھائی چونکہ شاعر طبع تھے اس لیے کوٹھے کے اکلوتے کمرے میں ان کا بسیرا تھا۔ وہ پڑھائی کے بہانے کبھی پتنگ اڑاتے، کبھی شعر گنگناتے۔ سردیوں میں سر میں تیل لگا کر دھوپ سینکتے۔ کوئی منع کرنے والا نہ تھا۔

''اوئے شاہد کیا بن رہا ہے کنجرا۔۔۔۔''

شاہد بھائی کی باچھیں کھل جاتیں۔

''آؤ آؤ چاچی ۔۔۔۔آؤ۔۔۔۔''

''یہ ریڈیو لگا ہوا تھا۔آواز آ رہی تھی سیڑھیوں پر۔بند کیوں کر دیا۔۔۔کس شاعر کا کلام تھا؟۔۔۔۔''تجاہل عارفانہ سے چاچا کہتا۔

''نہیں۔۔۔۔چاچی میں ن خود پڑھ رہا تھا شعر۔۔۔۔''

''سنا مجھے کس کا شعر تھا۔۔۔۔۔؟''

''میرا اپنا شعر تھا چاچی''

''واہ بھئی واہ سبحان اللہ کمال کر دیا یار شعر لکھنے لگ پڑا۔۔۔۔''

اب شاہد بھائی اپنے بے وزنے شعر،نثر نظمیں اور انشائیے سنانے میں مشغول ہو جاتے۔چاچا صمد بغیر سنے کھل کھل کر داد دیتے۔۔۔بچہ پارٹی نچلی منزل سے سرکتی اوپر کوٹھے پر جا پہنچی۔چاچا صمد گھر کا پائیڈ پائپر تھا۔بھی اس کی آواز پر سرکتے کھسکتے چلے آتے۔بچوں کے ساتھ چاچا صمد کا معاملہ اور بھی کھلم کھلا تھا۔کسی کے پیٹ میں انگلی ٹھونسی۔اپنے کانوں کے ساتھ ہاتھ جوڑ کر پھڑپھڑائے اور ہاتھی بن کر ہنسا دیا۔بچوں کو پیچھے لگا

لیا۔ایسے موقعوں پر چاچا صمد Veutrilocust بھی بن جایا کرتے،کبھی بلی کی طرح میماتے،کبھی بندر بن کر خوخیاتے۔۔۔شیر بن کر دھاڑتے تو چھوٹے بچوں کی آنکھوں کا قرنیا پھیل جاتا۔چاچا کے آنے پر شاہد بھائی سے چھوٹے ہم تین تو موجود ہوتے ہی تھے،محلے کے دوسرے بچے بھی خود بخود آتے چلے جاتے۔

سارا گھرانہ چاچے کی آمد پر خوش ہوتا صرف ابا کے ماتھے پر بل سیدھے نہ ہوتے۔پاکستان آتے ہی اسے بیوی بچوں کی کفالت میں مشکل پیش آ رہی تھی۔ابا اتنا سنجیدہ مزاج آدمی تھا کہ اس کے سامنے ہنس بول نہیں سکتا تھا۔خوشی کا یہ قاتل نہ خود خوش رہتا،نہ کسی اور کو خوش رہنے کی اجازت دیتا۔وہ عام طور پر چاچا صمد کے آتے ہی گھر چھوڑ کر باہر نکل جاتا اور کم از کم ہم سب کو اتنی آزادی بخش دیتا کہ ہم چاچا کی

صحبت سے لطف اندوز ہو سکیں۔

اب کے باہر جاتے ہی گھر میلے کی شکل اختیار کر لیات ۔۔۔۔شاہد بھائی سے چھوٹی رفعت آپا کی سہیلیاں نہ جانے کہاں آ جاتیں حالانکہ سانده کلاں میں ہمارے پاس فون نہ تھا۔یہ لڑکیاں کھی کھی کر

ہنسنے، گوٹے کناری کو پسند کرنے والی اور فلمی گانوں پر جان چھڑکنے والیاں تھیں۔چاچا صمدان میں گدگدی کی کیفیت پیدا کرتا اور خود ہنسے بغیر کئی لطیفے بیان کرتا۔

لڑکیوں کے ساتھ چاچا صمد بالکل فطری تعلق بناتا۔اس میں مرد عورت کی ازلی بے تکلفی اور اعتماد ہوتا۔جھڑکنے، گستاخ ہونے، جھوٹ بولنے، حیلہ بازی کے باوجود رشتہ کبھی نہ ٹوٹتا اور لڑکیاں ہمیشہ گزشتہ رابطے کو بڑی آسانی سے جوڑ لیتیں۔چاچا صمد یہ جانتا تھا کہ لڑکیاں کسی بات کو دیر تک سنجیدگی سے نہیں لیتیں پھر اسے یہ علم تھا کہ بعض اوقات لڑکیاں چھوٹی سی چھوٹی بات کو بیحد سنجیدگی سے محسوس کرتی ہیں اور ساری زندگی نہیں بھولتیں۔دونوں طرح کی لڑکیوں میں چاچا صمد کا رویہ غیر زمہدارانہ رہتا لیکن کسی لڑکی نے چاچے کی بات پر دیر تک منہ نہیں تھتھایا، نہ ہی اس کی کسی سے شکایت کی۔چاچا چک چونڈی پر ایمان نہیں تکھتا تھا۔وہ ذہنی طور پر لڑکیوں کے اس قدر گدگدی کر لیتا کہ لڑکی ساری کی ساری زعفراں زار بن جاتی، کیونکہ رابطوں کے لیے یہاں ہمیشگی کی شرط نہیں تھی، اس لئے گلہ گزاریاں کم ہوتیں۔

ہمارے گھر میں چاچا صمد کا آنا مثل عید کے تھا۔۔۔۔اور یہ بات ہے کہ وہ اپنی پتنگوں کی دوکان چھوڑ کر روز روز نہ آ سکتے۔چاچا اوپر سے ہنسوڑ اور بچہ جمورا اور اندر سے حلال روزی کمانے والا سنجیدہ دوکاندار تھا۔اس کا یہ تضاد ہرگز تکلیف دہ نہ تھا۔

چاچا صمد کو جب بھی یاد کرتا ہوں، ایک بھولی بسری کہانی یاد آ جاتی ہے۔

خراسان کے ایک بادشاہ کے تین بیٹے تھے، بڑے دو ذہین فطین اور بڑے جی دار تھے جبکہ سب سے چھوٹا سادہ خاموش اور دنیا داری سے گھبرانے والا تھا، جونہی شاہ جم جاہ اپنی طبعی عمر کو پہنچا اور کار سلطنت اس کی طبعیت پر بوجھل محسوس ہوا، وہ متفکر رہنے لگا۔ ایک روز اپنے تینوں فرزندوں کو طلب کیا اور ان سے گویا ہوا۔۔۔۔ ''اے فرزندان عالی وقار میرا عہد اقتدار انجام کو پہنچا۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ میں اپنا ولی عہد مقرر کروں اور امور سلطنت میں اس کی تربیت کسی ایسے زیرک اور ذی ہوش اتالیق کے سپرد کروں کہ سلطنت کے رموز سے اسے بخوبی آگاہی ہو اور منزل بہ منزل رعایا کی فلاح کا باعث ہو۔''

بڑے بیٹوں نے نفرت سے اپنے کم علم بھائی کی جانب حقارت سے نظر کی اور کہا۔۔۔۔ ''عالم پناہ! ہمارا یہ بھائی نیم پاگل، ناخواندہ اور معاملہ فہم نہیں۔ یہ سلطنت دشمنوں کے حوالے نہ ہو جائے۔''

ظل الٰہی انصاف پسند تھا۔ فرمایا۔۔۔۔ ''شرط انصاف یہی ہے کہ تم تینوں اپنی قسمت آزماؤ دیکھو۔ میں اس شہزادے کو اپنا وارث بناؤں گا جو میرے لئے دنیا کا سب سے خوبصورت قالین لائے''۔ پھر وہ تینوں شہزادوں کو لیکر محل کی چھت پر پہنچا اور اپنے ہاتھ سے تین مور پنکھ دیئے۔۔۔۔۔ ایک پر مشرق کی جانب اڑتا گیا، دوسرے مور پنکھ نے مغرب کی سمت لی اور تیسرا پر کچھ دیر چکر پھریاں لیتا بے سمتا کچھ دور جا کر جنگل میں گر پڑا۔

بڑے بیٹے نے مشرق کی جانب مور پنکھ کا تعاقب کیا۔ منجھلے شہزادے مغرب کی جانب بھاگے اور سادہ لوح جنگل کی جانب نکل گیا۔ کچھ دیر بعد ایک مور پنکھ اڑتا ہوا آیا اور ایک شاخ میں اٹکا، پھر تا مک ٹوئیاں مارتا زمین پر ایک مینڈک پر جا گرا۔

مینڈک فوراً بولا۔۔۔۔ ''اے نوجواں اس رونے کی وجہ؟''

شہزادے مینڈک کی بات سن کر حیران ہوا۔ پھر اپنا ماجرا بیان کیا۔ مینڈک

پھدک کر کچھ فاصلے پر گیا اور شہزادے کو ایک پتھر پر مور پنکھ پھینکنے کو کہا۔ پتھر پر مور پنکھ کا گرنا تھا کہ شاخ سے آواز آئی۔ پتھر دولخت ہو گیا۔ نیچے کی جانب اترتا سنگ مرمر کا زینہ نظر آیا۔ اب آگے آگے مینڈک اور پیچھے پیچھے شہزادہ روانہ ہوا۔ نیچے اتر کر کیا دیکھتا ہے کہ ایک آراستہ پیراستہ کشادہ ہال ہے جس میں بھانت بھانت کے مینڈک کورس میں مل کر گا رہے ہیں۔۔۔۔ رہبر مینڈک نے کہا۔۔۔۔ ''سنو حاضرین! ہمارے مہمان کو ایک ایسا قالین درکار ہے جس کا کوئی ثانی نہ ہو''۔ سارے مینڈک تھوڑی دیر کے لئے غائب ہو گئے۔ پھر ایسا منقش صندوق اٹھا کہ باید و شاید۔۔۔۔ شہزادے نے کانپتے ہاتھوں سے ڈھکنا کھولا۔ دیکھتا کیا ہے کہ ایک نادر زمانہ قالین ایسا کہ عقل دنگ رہ جائے۔ نقش و نگار دیدہ زیب، خوبصورتی میں لاثانی، اون ریشم سے بھی نرم اور لچکیلی رنگوں کی نسبت بے مثل۔۔۔۔ شہزادے نے قالین کو کندھے پر دھرا، مینڈک کا شکریہ ادا کیا اور بادشاہ سلامت کی خدمت میں کورنش بجالایا۔ بڑے بھائی زیر لب مسکرائے۔ یقین پختہ تھا کہ اتنی کم علمی اور سادگی اسے کسی طور پر پسندیدہ قالین نہ لانے دے گی۔

پہلے بڑے شہزادوں نے اپنی دریافتیں دکھائیں۔ پھر چھوٹے شہزادے کو ازن ملا۔ جونہی قالین فرزدہوا۔۔۔۔ سب دنگ رہ گئے۔ شاہ عالم پناہ بستر مرگ سے اٹھا اور نحیف آواز میں گویا ہوا۔۔۔۔ ''میرا فیصلہ مشیت نے کر دیا۔ آج کے بعد یہی میرا وارث ہے۔''

بڑے شہزادے نے کہا۔۔۔ ''اے آقا یہ اتفاق محض ہے، ورنہ یہ شہزادہ ایسی اہلیت نہیں رکھتا کہ امور سلطنت سنبھال سکے ناخواندہ مجبور محض ہے۔ زمانہ شناسی سے آشنا نہیں۔ گھڑ سواری کا علم نہیں رکھتا۔ سپاہ گری میں کورا ہے۔۔۔۔ تو کیوں اپنی سلطنت کے امور ایک ایسے فاتر العقل کے سپرد کر رہا ہے جو ابتری کا باعث ہوں؟''